تینتیسواں سفر ۔ پاکستان چلو

حج سے واپسی کے بعد پیر سنبھلنے میں جو وقت لگا سو لگا، ہم نے اسی حالت میں لاس انجلس اور سان فرانسسکو کے درمیان اسی طرح پھیرے جاری رکھے۔ ان پھیروں میں اکثر ہم نے یونائیٹڈ ایئر لائنز سے سفر کیا۔ ہم اس کے فریکوئنٹ فلائر ممبر بن گئے۔ امریکہ میں ہوائی کمپنیوں نے مسافروں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے انہیں ہر سفر پر پوائنٹس دینے شروع کر دیئے تھے۔ تقریباً ایک میل کا ایک پوائنٹ ہوتا ہے۔ جب ہمارے ۲۵۰۰۰ میل ہو جاتے تو ہمیں یونائیٹڈ سے ایک مفت کا ٹکٹ مل جاتا تھا۔ اسی طرح کی ایک پرواز پر لاس انجلس سے اوکلینڈ آ رہے تھے السوبرانتے کے لئے۔ جہاز میں بیٹھے تو ہمارے برابر ایک یورپی نژاد امریکی صاحبزادے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس بیٹھے تو اندازہ ہوا!!! ہم نے رومال سے ناک ڈھک کر منہ کھڑکی کی طرف کر لیا اور اپنا بیگ پیروں کے پاس رکھ لیا۔ اِن صاحبزادے نے بہت سعادت مندی سے ہمارا بیگ ہم سے پوچھے بغیر نشست کے اوپر سامان کے خانے میں رکھ دیا۔ بیگ میں ہمارے پان تھے۔ اب ہمیں جب پان کی یاد آئی تو ہم نے ان سے اپنا بیگ اتارنے کو کہا۔ انہوں نے نہایت سعادت مندی سے بیگ نیچے اتارا اور ہمارے پان کھانے کے بعد بیگ کو دوبارہ اوپر رکھ دیا۔ ایک گھنٹے کی پرواز تھی اور ہم نے اس میں کم از کم تین مرتبہ پان کھانے کے لئے ان سے یہ بیگ نیچے اتروایا۔ یہ ہمارا بیگ نیچے اتارتے اور ہم جیسے ہی پان کھانے سے فارغ ہوتے، یہ اسے اوپر رکھ دیتے۔ ہم پھر کہتے ''گیومی مائی بیگ''۔ تیسری مرتبہ ہمیں بیگ دینے کے بعد انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر انہوں نے اپنی نشست بدل لی۔ ہماری جان میں جان آئی اور ہم نے ناک سے رومال ہٹا لیا۔

انسان سفر میں ہوتو واقعات اور مشاہدات یکے بعد دیگرے مسلسل چلتے ہیں۔ اگر مسافر یہ سفر سوتے میں کرے تو سفر، سفر نہیں ہوتا۔ ہم تو سفر میں سو ہی نہیں سکتے ہیں۔ نیند جہاز کے ہلکوروں سے بھی نہیں آتی۔ کبھی آنکھ بند بھی کر لی تو ایئر ہوسٹس صاحبہ آن وارد ہوتی ہیں۔ پھر کبھی ہم پڑھنے لگتے ہیں اور کبھی بُننے بُنانے کو کروشیا ہاتھ میں ہوتا ہے۔ غیر ملکی سفر میں کوئی ہمسفر بھی ایسا نہیں ملتا جس سے کسی خاص موضوع پر گفتگو جاری رہ سکے۔ غرض اسی طرح ہم نے لاس انجلس اور اوکلینڈ/ سان فرانسسکو کے درمیان مزید پانچ سفر طے کر لئے۔

اب گھر پہنچے، ستمبر ختم ہونے والا تھا اور یہاں گرمی بہت ہو رہی تھی۔ سان فرانسسکو کے علاقہ میں اپریل اور مئی میں گرمی ہوتی ہے، لیکن جون، جولائی اور اگست اتنا گرم نہیں ہوتا۔ پھر ستمبر اور اکتوبر میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ شمس اپنے ایک پراجیکٹ میں مصروف تھے اور دن و رات برکلے میں اپنے دفتر میں رہتے تھے، ہم اکیلے گھر میں رہتے تھے۔ اسی طرح مزید تین ہفتہ گزرے تھے کہ شمس کی ایک جرمن دوست اینکا شوبرٹ اپنے شوہر کے ساتھ جرمنی سے کیلیفورنیا دیکھنے آئیں۔ یہ صاحبہ خود عورتوں کی ڈاکٹر تھیں اور ان کے شوہر کلاؤس مائن ہارٹ کسی بنک میں کارپوریٹ وکیل تھے۔ ان کے ابھی بچے کوئی نہیں تھے۔ ہم نے انہیں اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا۔ سارے دن یہ شہر میں رہتے اور رات کو آتے۔ کھانے کے بعد سب باتیں کرتے اور پاکستانی کھانوں کی تعریف کرتے تو ہم ان کو پکانے کی ترکیبیں بتاتے۔ اسی طرح ۱۷/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو بھی یہ سب باہر گئے ہوئے تھے اور شمس اپنے دفتر میں تھے۔ ہم عصر کی نماز پڑھ کر تسبیح پڑھ رہے تھے کہ ایسا لگا کہ پورا گھر کسی نے ایک جھولے میں ڈال کر لمبے لمبے پینگ دینا شروع کر دیئے ہوں۔ ہم نے سوچا، ''ارے روکو اِسے، اب ہماری جھولے کی عمر نہیں رہی''۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ زلزلہ آیا ہے اور بہت بڑا ہے۔ تمام فانوس اور پردے بُری طرح جھول رہے تھے۔ کھڑا ہونا چاہا مگر ہم خود کو سنبھال نہ سکے اور جائے نماز پر بیٹھ کر دعائیں مانگنے لگے.....

ابو تُراب ادرِکنی، ابو تُراب ادرِکنی ----

زلزلہ کے جھٹکے کم از کم دس پندرہ سیکنڈ چلے، لیکن ہمیں یہ لگتا رہا کہ ہر چیز بعد میں بھی ہلتی رہی ہو۔ تمام فانوس اور پردے پانچ دس منٹ تک ہلتے رہے، گھر کے باہر درختوں میں بھی بھونچال آیا ہوا تھا کہ یہ نئے درخت لگے تھے اور ان کے تنے اور شاخیں پتلی سی تھیں۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد شمس کا فون آیا، پتہ چلا کہ پورے

بے ایریا میں فون کی لائنیں استعمال میں آ گئیں تھیں ۔ پھر یہ فوراً گھر آئے ۔ ہم سے خیریت پوچھی اور پورے گھر کے چاروں طرف جائزہ لیا، گیس کی لائن اور بجلی کے تار ۔ خدا کا شکر تھا کہ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن جیسا کہ ہمیں شام کو اور بعد میں پتہ چلا، یہ ۷ء۲ رکٹر اسکیل کا زلزلہ تھا اور اس سے بے برج اور کئی دومنزلہ فری ویز کی اوپری منزلیں ٹوٹ کر نیچے کی منزلوں پر گری تھیں جس سے کہ ۷۰ کے قریب انسان فوت ہو گئے تھے ۔

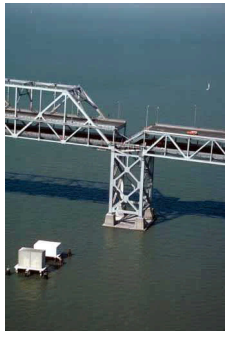

سان فرانسسکو ۱۹۸۹ء ۔ زلزلہ سے 880-I فری وے کی اوپری منزل گر کر نیچے کی منزل پر، اسی طرح سے بے برج کی اوپری منزل گر کر نیچے کی منزل پر (فوٹو بشکریہ یونائیٹڈ اسٹیٹس جیالوجیکل سروے)

زلزلہ سان فرانسسکو کا دیکھا ہم نے
خواب جینے کے لئے، موت کے گھر سے گزرے
بے برج ٹوٹ کے رستے ہی کٹے ملنے کے
پھر بھی اس جگہ گئے اور اُدھر سے گزرے

سلطانہ آدا، ۱۹۹۹ء

شام کو اینکا اور کلاؤس گھر پہنچے تو اُن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سان فرانسسکو میں تباہی ہوتے دیکھی تھی ۔ یہ ایک فیری میں تھے جو سان فرانسسکو میں برتھ سے لگ رہی تھی ۔ جب زلزلہ آیا تو ان کے سامنے سمندر کے کنارے کے کئی خوبصورت گھر ٹوٹ پھوٹ کر ملبہ بن گئے تھے ۔

اب یہ اتفاق ہی تھا کہ کئی مہینے پہلے ہماری دوسری بیٹی سیما کی شادی طے ہوگئی تھی اور فیصلہ یہ ہوا تھا کہ شادی کراچی میں ہو۔ رُخصتی کے بعد یہ پہلے روم (اٹلی) اور پھر وہاں سے نیویارک جانے کا منصوبہ بنا

رہی تھیں ۔ ہمارا کراچی جانا ضروری ہوگیا۔ پیر بھی بہتر ہو چکا تھالہذا ہم ۲۲رنومبر ۱۹۸۹ءکوامریکہ سے روانہ ہوئے اور ۲۴رکو ہم کراچی پہنچ گئے ۔اب پاکستان سے آئیں یا پاکستان جائیں، سفر کا دورانیہ تقریباً ۲۳رگھنٹے تک کا ہوتا تھا، چاہے آپ نیویارک سے ہوتے ہوئے پی آئی اے سے جائیں یا سنگاپور ایئر لائنز سے سنگاپور ہوتے ہوئے ۔اس کے علاوہ دوسری ایئر لائنز بھی ہیں جو کم پیسے لیتی ہیں لیکن وہ تمام دنیا میں گھماتی پھراتی لے جاتی ہیں ۔ہم زیادہ تر انہی دونوں ایئر لائنز سے آئے گئے ۔اب پی آئی اے کی چاہے سیٹیں خراب ہوں یا روّیہ ،لیکن اس میں کھانا اپنی پسند کا ہوتا ہے اور لمبے وقت کی پرواز میں اس کھانے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے ۔ یہاں ایئر ہوسٹسیں ہمیشہ غصّہ میں نظر آتی ہیں ۔بعض مرتبہ تو مرد بھی کھانا پانی دیتے نظر آتے ہیں لیکن ایسے اکڑے ہوئے جیسے ہم مفت سفر کررہے ہوں اور یہ صاحب مسافروں پر احسان کررہے ہوں کہ دیکھو، کیسے سخی ہیں کہ کھانا پینا دے رہے ہیں ۔اب لفت ہنزا اور امیریٹس ایئر لائنز کی میز بانی ہمیں بہت اچھی لگی ۔سعودی ایئر لائنز بھی مناسب ہے اور سنگاپور ایئر لائنز کے میز بان بھی اچھے ہیں ۔ پی آئی اے کے میز بان خبرنہیں کہ مسافروں سے نالاں کیوں رہتے ہیں کہ مسافروں میں بھی ہم نے لاجواب ہستیاں دیکھی ہیں ۔ یا یہ کہ ایک نہایت غریب ملک میں فلائٹ اسٹیورڈز کی ملازمت اعلیٰ تصوّر ہوتی ہے جس سے روّیہ میں رعونیت آجاتی ہے ۔غرض ہم سان فرانسسکو سے نیویارک یونائیٹڈ ایئر لائنز سے گئے ۔ کیونکہ ہم ''فریکوئنٹ فلائر'' تھے ،ہمیں جلدی اوراچھی جگہ دی گئی ۔اب نیویارک آئے تو یہاں ایک دن اپنے رشتہ داروں کے یہاں رکنا بھی ضروری ۔ ہمارے پہنچتے ہی یہاں برف گرنا شروع ہوگئی تو ہم پریشان کہ کہیں زیادہ ہوگئی تو ایئر پورٹ بند نہ ہوجائے ۔ہم اسی برف میں ہوتے ہوئے ہوائی اڈّے پہنچے تو جہاز بالکل صحیح وقت پر جانے کو تیار ملا ۔خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی ۔اب یہاں سے پرواز چلی تو ایئر ہوسٹسیں خلافِ توقع بہت اچھی طرح میز بانی فرما رہی تھیں اور کھانا حسب معمول ہماری پسند کا تھا۔ پرواز ٹھیک وقت پر چلی اور کراچی تک آئی ۔ راستہ میں کہیں کوئی خرابی نہیں ہوئی گرچہ پیرس ، فرینکفرٹ اور استنبول تک گہرے بادل اور برفباری ملی ۔ٹرمینل پر سامان بھی بہت جلدی پہنچا اور ہم آدھے گھنٹے کے اندر ایئر پورٹ کے باہر تھے ۔ہم خوش ہوئے اور فیصلہ کیا کہ آئندہ کوشش کریں گے کہ پی آئی اے سے ہی سفر کریں ۔

کراچی پہنچتے ہی پھر نئے سرے سے حج کی دعوتیں شروع ہوگئیں ۔اسی میں کئی مہینے گزر گئے ۔ کراچی کے حالات بہت خراب تھے ۔ کبھی کرفیو ہوتا، کبھی کوئی ہنگامہ ہوتا، اور کبھی اغوا، قتل اور پولیس

مقابلہ۔اس سے پہلے ۱۹۸۲ء میں بہت ہنگامے ہوئے تھے اور اس کے بعد حالات کبھی نہیں سدھرے ۔جس سیاسی جماعت کو کوئی ہنگامہ کروانا ہوتا تھا وہ اسے کراچی میں کرواتی تھی جس سے یہاں کے طالبانِ علم کے وقت کا زیاں ہوتا، لوگوں کی روزی جاتی، یہاں کی معاشی حالت بھی خراب ہوتی، اور تمام دنیا میں کراچی کی بدنامی ہوتی جس سے باہر والے بھی کراچی میں پیسہ لگانے سے انکاری ہوتے ۔کراچی کے لوگوں کو اِس کا اندازہ تھا اور یہ اس ہنگامہ میں ملوث نہیں ہونا چاہتے تھے، اور نہ ہی ملوث ہوتے تھے۔لیکن ہنگامے پھر بھی ہوتے تھے، اور اگر کوئی شہری ہنگامہ کرنے کو نہ ملے تو پولیس خود ہی کچھ نہ کچھ کر دیتی تھی جس میں سیاسی شخصیات کا کھلے عام ''پولیس مقابلہ'' میں ہلاک ہونا وقت کی سب سے بڑی تفریح تھی۔

ظاہر ہے کہ ہوتا وہی ہے جو اوپر والے چاہتے ہیں۔لوگ تو شطرنج کے مہرے ہیں اور چالوں میں بڑی جیت کے لئے چھوٹے مہرے تو پٹتے ہی ہیں۔اب بڑے مہرے کون ہیں اور چالیں کیا اور کس کے فائدے کی ہیں، یہ کون جواب دے گا۔جواب دینے والوں کی زبان بند کر دی جاتی تھی، دھمکی، پیسہ، یا بساط پر ان کی جگہ بدل کر۔دوسری طرف فلسطین میں مسلمانوں کا انتفادہ چل رہا تھا اور یہودی اگر مسلمانوں کی جگہ پر قبضہ کر لیں تو جائز، لیکن اگر مسلمان اگر اپنی جگہ واپس مانگیں تو دہشت پسند کہلاتے تھے۔ہم امریکہ میں ٹیلی ویژن پر ایک کے بعد ایک انٹرویو دیکھ رہے تھے کہ ہر ماہر دہشت انگیزی کے بارے میں اپنی رائے دیتا تھا اور ہر سیاستدان مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتا رہتا تھا۔کسی نے ایک لمحہ کے لئے یہ نہیں سوچا کہ فلسطینیوں کی زمین پر قبضہ کر کے انہیں مہاجر بنا دینے کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

کراچی کے ہنگامے اس قدر بڑھے کہ ملک میں اور ملک کے باہر بے نظیر بھٹو کے طرفدار کم رہ گئے۔یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان ہنگاموں میں کتنا ملک کے اندر ان لوگوں کا ہاتھ تھا جو ایک عورت کی حکومت برداشت نہیں کر سکتے تھے اور کتنا ہاتھ بے نظیر کا اپنا تھا کہ انہوں نے ہنگاموں کے سلسلہ میں بری طرح ناکامی کو اپنی حکومت کا اُصول بنا لیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ صدر غلام اسحاق خان نے ان کی نوکری برخواست کر دی، اور نیشنل اسمبلی بھی برخواست کر دی۔نئے سرے سے انتخابات ہوئے اور اب نواز شریف وزیرِ اعظم بن گئے۔اسی سال پولیس نے حیدرآباد میں ۶۰ر سے لے کر ۱۰۰ر افراد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور حکومت نے کسی کے خلاف کوئی الزام نہیں لگایا کہ اتنے شہریوں کو اپنی ہی پولیس کے ہاتھوں موت انتہائی عبرت کی بات ہے۔

پاکستان ایک مضبوط قلعہ ہے مسلمانوں کے لئے۔ آس پاس کے علاقے کے مسلمان متحد ہو جائیں کہ ایران، افغانستان، عرب امارات اور دوسری ریاستیں اپنی دماغی، مالی اور افرادی طاقتیں متحد کر دیں تو مسلمانوں کے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے۔ اسی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے پر زور ہے طاغوتی طاقتوں کا۔ مسلمانوں کے ہتھیار ایمان، اتحاد اور تنظیم، یہی تو تھے اور اب بھی ہیں۔ مگر یہ ہتھیار اٹھانے والے ہاتھ اور چلانے والے دماغ اور دلوں میں اب دوسری چیزیں آ گئی ہیں۔ یہ ادلتے بدلتے حالات دماغ کو صحیح سمت سوچنے نہیں دیتے، لیکن روشنی تو ہم نے خود اپنے بچوں کے دلوں میں رکھنا ہے۔ اُجالا دکھانا ہے اور ہمت و حوصلہ بلند رکھنا ہے۔

جہاں یہ ہنگامے تھے، وہاں زندگی کو تو رواں دواں رکھنا تھا۔ ہماری بیٹی سیما کی رخصتی جو ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۰ء کے دن کی طے ہوئی تھی اور یہ تاریخ ہنگاموں سے گھری ہوئی تھی۔ تمام محفلیں دن میں ختم کرنا ہوتی تھیں کہ شام کو ہنگامے، چوریاں اور ڈاکے لازمی تھے۔ بس شادی میں شریک ہونے کے لئے اپنے زیور بنک سے نکالیں، اور بنک بند ہونے سے پہلے واپس جمع کر دیں۔ قمر کا گلشنِ اقبال والے گھر میں روشنیوں کے ساتھ ساتھ چوکیدار مستقل پہرے پر رہا۔ گھر کا باہری حصّہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کراچی کی سنٹرل جیل کی دیواریں۔

کراچی: گلشنِ اقبال میں بیٹے قمر کا گھر۔ شادی کی روشنیاں، بیرونی دیواروں پر نوکیلی سلاخیں، اسلحہ بردار چوکیدار

ان تمام حالات کے باوجود ہمارے بیٹے قمر نے شادی کا بہت نفیس انتظام کیا تھا جس کی ہر ایک نے تعریف کی۔ شادی کے چند ہی دنوں کے بعد میاں بیوی اٹلی روانہ ہو گئے، وہاں ہمارے داماد حسن کے ماموں رہتے تھے۔ ان کی میلان اور روم میں دکانیں تھیں۔ اس کے چند دنوں کے بعد یہ نیویارک چلے گئے جہاں سیما اور حسن نے کوئنز کے علاقے میں ایک گھر خرید لیا۔

ہم پاکستان میں مزید ایک سال رہ گئے۔ ہنگامے اپنی جگہ لیکن پھر بھی پاکستان میں ابھی بھی ہمارے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں، رشتہ دار عزیز اقارب تھے اور رہنے میں زیادہ گہما گہمی تھی۔ اسی میں یہ ہوا کہ قمر اپنے بزنس کے سلسلہ میں گورنمنٹ کے دفتر میں کام کے سلسلہ میں اسلام آباد جانے کا کرنے لگے تو ہم نے بھی ان کے ساتھ وہاں بیٹے نجم اور ان کی بیگم اور بچوں سے ملنے کا طے کیا۔

اسلام آباد کا سفر، 'لپک جھپک میں'

پی آئی اے سے نشستیں مخصوص ہوئیں۔ اب ایئرپورٹ پہنچے۔ یہ ایئربس A-300 طیارہ تھا اور بالکل نیا سا تھا۔ ہم ماضیٔ قریب میں امریکہ کے طیاروں میں بیٹھ چکے تھے اور یہ جہاز یقیناً اندر سے صاف ستھرا تھا۔ ویسے بھی ہماری پی آئی اے اسلام آباد جانے والے طیاروں کو خوب چمکا کر رکھتی ہے کہ اس میں ''صاحب لوگ'' سفر کرتے ہیں۔ جہاز نے اڑان شروع کی تو اندازہ ہوا کہ ایئربس میں اندر ہوا کا شور زیادہ تھا۔

پی آئی اے کی ایئربس A300۔ اڑان وہی اور طیارہ نیا۔ کراچی سے اسلام آباد۔

پونے دو گھنٹے میں ہم اسلام آباد کی پہاڑیوں پر تھے اور ہر طرف بارش کا سماں تھا۔ جھکڑ چل رہے تھے لیکن یہ طیارہ ان تمام دشواریوں سے مقابلہ کرتا ہوا نہایت سکون سے اسلام آباد کی رنوے پر اُترا۔ نجم اور بہو رعنا ہمیں لینے ایئرپورٹ پر تھے، بچے بھی تھے۔ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ قمر کو یہاں صرف اسی دن کام کر کے دوسرے دن صبح کراچی واپس جانا تھا، لہٰذا وہ وہیں سے ٹیکسی کر کے سیکریٹریٹ روانہ ہو گئے اور شام کو گھر لوٹے۔ ہم ان بچوں کے ساتھ ان کے گھر پہنچے جو یہاں کے ایف ۷ بلاک میں تھا۔ اس بلاک میں آئے تو آنکھیں بند کرنا مشکل۔ کیا کیا عالیشان گھر اور کتنا قیمتی فنشنگ کا کام تھا۔ سارے گھر حکومتِ پاکستان کے ملازمین کے تھے اور ہر گھر اس زمانے کے پچاس لاکھ سے ایک کروڑ روپیہ کا تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ ''یا رب، یہ کیسے سرکاری ملازم ہیں کہ اتنی سی تنخواہوں میں ایسے گھر کھڑے کر لیتے ہیں''۔ ہمارے شوہر ذاکر

صاحب تو بس ایسے ہی رہے کہ تنخواہ آتی تو کھانے پینے کا چلتا رہتا۔ اسی طرح نجم خود بھی بہت اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائض تھے لیکن پھر بھی کرایہ کے گھر میں رہتے تھے کہ تنخواہ اتنی تھی ہی نہیں کہ چھوٹا سا بھی گھر بنوا سکیں۔

اسی دن ہم سب ایک کار میں بھر کر شہر دیکھنے نکلے۔ شکر پڑیاں اور دامنِ کوہ دیکھا اور وہیں کھانا بھی کھایا۔ نیچے پورا شہر نظر آتا تھا اور ہر طرف ہریالی تھی۔ تمام عمارتیں سفید رنگ کی تھیں جو سبزے میں نکھر کے اُبھر آئی تھیں۔ کھانا کھا کر جو کار میں بیٹھنے لگے تو ایسا لگا کہ مسافر بہت زیادہ ہوں۔ گِنا تو اتنے ہی نکلے جتنے پہلے تھے، یعنی صرف چھ، جس میں تین کم سن بھی تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ سب کھانا کھانے کے بعد پھیل کر بیٹھ رہے تھے لہذا جگہ کم لگ رہی تھی۔ پھر یہ سوزوکی کار تھی اس میں ویسے بھی جگہ کم ہوتی تھی۔

دوسرے دن یہ طے ہوا راولپنڈی جایا جائے اور اپنے پرانے بنگلے کو دیکھا جائے۔ بارش ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے کار کے اندر شیشے پر دُھند جم رہی تھی۔ باہر تو وائپر چل رہے تھے اور اندر بچوں میں حنا بار بار ایک کپڑے سے شیشہ صاف کرے اور ثنا دوسرے کپڑے سے۔ پنڈی کنٹونمنٹ میں یونیک روڈ پہنچے اور اپنے پرانے بنگلے کی طرف رُخ کیا۔ ظاہر ہے کہ ۳۶ سال کے عرصہ میں سب کچھ بدل چکا تھا۔ کہہ نہیں سکتے کہ ہمارا بنگلہ اپنی جگہ تھا یا نہیں۔ سارے بنگلوں کا نا قابلِ بیان حال تھا، لان اور پھولوں کی کیاریوں کی جگہ خودرو گھاس پھوس نے لے لی تھی۔ قریب ہی وہ حصہ تھا جہاں حوالداروں اور نان کمیشنڈ افسروں کے گھر تھے، لیکن اب وہ گھر ڈھا کر ان کی جگہ فوج کا میڈیکل کالج بن گیا تھا۔ عمارت سے لگتا تھا کہ یہ کالج اچھا ہی ہوگا۔

راولپنڈی: ۱۹۵۳ء کے مینا بازار کے بعد ایک ڈاکٹر احمد صاحب اس اونٹ پر سوار ہو کر ہمارے بنگلے کے پیچھے آ گئے تھے، اور بائیں طرف ۱۹۹۰ء میں بنگلہ غائب اور اس کی جگہ آرمی میڈیکل کالج کی مین بلڈنگ۔

سڑکوں، عمارتوں اور درخت کی تراشی ہوئی شکلیں دیکھ کر لگتا تھا کہ یہاں اچھی ترقی ہو رہی تھی۔

ہم اس ترقی کو سراہتے ہوئے لال کرتی پہنچے۔ ہر چیز بدل چکی تھی اور یہ ایک نیا شہر لگتا تھا۔ پھر ہم مال روڈ سے گزرتے ہوئے واپس اسلام آباد آ گئے۔

دوسرے دن ہم فیصل مسجد گئے۔ بہت خوبصورت عمارت ہے۔ عورتوں کی نماز پڑھنے کی جگہ اوپر ہے لیکن کسی وجہ سے وہ بند تھی۔ دروازے پر تعینات ایک منتظم نے ہمیں اس بندی کے بارے میں مطلع کر کے یہ بھی کہا کہ ''بی بی جی، عورتیں اندر منع ہیں۔ نماز پڑھنا ہے تو باہر نماز پڑھیں ویسے یہ صاحب جی اندر جا سکتے ہیں''۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہمیں انتہائی افسوس ہوا کہ یہ سعودی عرب کا نیا اسلام اس قدر غیر اسلامی اور غیر انسانی حرکتوں میں کتنا آگے آگے ہے۔ اتنی بارش میں تو امریکہ میں عیسائی چرچ بھی کافر ترین انسان کو اندر بلا لیتا۔ غرض ہم نے اسی بارش میں باہر کھلے صحن میں مسجد کی دو رکعات نفل پڑھی اور اس دوران نجم ہمارے اوپر چھتری سے سایہ رکھنے کی کوشش میں خود بھیگتے رہے۔ اسلام آباد میں ہم تین ہفتہ رکے اور اس کے بعد نجم اور ہم واپس جہاز سے کراچی پہنچے۔ اس پرواز پر ہمارے برابر ٹی وی کے کمال احمد رضوی بیٹھے تھے اور نجم نے اپنے بچوں کے لئے ان کے آٹوگراف لئے جو انہوں نے بہت انکساری سے دیئے۔ یہ صاحب ہمیں بہت نفیس لگے۔

نیویارک روانگی

کچھ ہی دنوں بعد خبر آئی کہ ہماری بیٹی نیویارک میں امّید سے ہیں اور ہم نے پھر نیویارک جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اسی اثناء میں ہماری امریکہ میں امیگریشن کے کاغذات بھی مکمل ہو گئے تھے اور شمس نے کراچی میں کونسولیٹ سے جلدی کروا کر ہمارا انٹرویو طے کروا دیا۔ ان ہی دنوں بیٹے اعجاز کی دلہن فرحانہ بھی اپنے امیگریشن کے سلسلے میں کونسولیٹ جانا چاہ رہی تھیں۔ ہم دونوں ساتھ کراچی میں امریکی کونسولیٹ گئے۔ اپنے نام وہاں درج کروا کر وقت لیا تو وہ دوپہر کے بعد کا تھا۔ ہم نے سوچا کہ یہاں انتظار کے بجائے چل کر کچھ شاپنگ کی جائے کہ دونوں ہی کو امریکہ جانے کی تیاری کرنا تھی۔ ہم نے ڈرائیور کو پکڑا اور قمر ہاؤس کے قریب مچھی بھایانی نامی ایک بازار کی طرف گئے۔ پہلی مرتبہ اس بازار کا نام سنا تھا۔ وہاں پہنچے تو بازار اچھا لگا اور دل کھول کے خریداری کر ڈالی، اور پورا پرس خالی کر کے گاڑی کی ڈکی بھر لائے۔ واپس آ کر کھانا کھایا اور اتنے میں انٹرویو کا وقت بھی ہو گیا۔ اب وہاں جن صاحب نے ہمارا انٹرویو لیا وہ یورپی امریکی یعنی گورے امریکی تھے لیکن انہوں نے اردو میں ہم سے کہا کہ ''آپ کو ویزا مل گیا ہے اور آپ ۱۹ر فروری کو جا سکتی ہیں''۔

ہم بہت خوش ہوئے اور اُن سے پوچھا کہ یہ زبان انہوں نے کہاں سیکھی۔ کہنے لگے کہ ''مجھے پسند ہے یہ زبان اور یہ یہاں ہی کہ لوگوں سے سیکھی ہے۔ پھر ایک ٹیوٹر رکھ کر بھی پڑھا ہے''۔ ان صاحب نے اپنا نام ''مسٹر کنگ'' بتایا۔ ہم خوش ہوئے کہ اچھا ہے کہ یہ اردو زبان کہاں کہاں جا رہی ہے اور کون لوگ اسے سیکھنا چاہ رہے ہیں۔ پھر ہم نے ان کو بتایا کہ ہم اپنی بیٹی کے ہاں اولاد کے سلسلے میں جلدی جانا چاہیں گے۔ یہ مسٹر کنگ صاحب اندر ایک دفتر میں گئے اور غالباً کسی اوپری افسر سے بات کر کے باہر آئے اور ہمیں بتایا کہ ہم ۱۴ر فروری کو بھی جا ہیں تو جا سکتے ہیں جو کہ پانچ دنوں کے بعد کی تاریخ تھی۔ انہیں امیگریشن کی معلومات کسی کمپیوٹر میں ڈالنا ہوتی ہیں جس میں غالباً ایک دو دن لگتے تھے۔ اب ان کنگ صاحب نے ہم سے ویزے کی فیس طلب کی تو ہمیں خیال آیا کہ فیس تو ہم مچھی میانی کے دُکانداروں کو دے آئے تھے۔ تھوڑی سی خفّت ہوئی۔ ہم نے اُن سے فیس باہر سے لانے کا وقت لیا۔ اب باہر آئے تو اتفاقاً ہمارے بیٹے قمر وہاں پہنچ چکے تھے۔ اُن سے معلوم کیا تو انہوں نے اسی وقت بریف کیس سے پیسے نکال کر حوالے کئے اور اس طرح ویزے کی کاروائی مکمل ہوئی۔ اس واقعے سے ہمیں اور فرحانہ کو ایک تجربہ ہو گیا کہ شاپنگ کے وقت ذہن کا دِل اور پرس سے آگے رہنا ضروری ہے۔

گھر آتے آتے شام ہو چکی تھی اور جانے میں دو دن رہ گئے تھے۔ خریداریاں بہت کرنا تھیں کہ بیٹی کے ہاں ولادت ہونے کو تھی۔ اب وہاں امریکہ سے جو لوگ پاکستان آتے ہیں وہ آدھی چھٹیاں خریداریوں میں گزارتے ہیں، ہم تو اب مستقلاً جا رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ ساری ہی چیزیں خرید کر لے جائیں۔ اسی طرح جب امریکہ سے واپس آتے ہیں تو یہی دل چاہتا ہے کہ سارا امریکہ خرید کر پاکستان لے آئیں۔ غرض یہ کہ جہاں بھی ہوں، زور شاپنگ پر ہوتا ہے۔ غرض ڈھیر سارا سامان جمع کر کے تیار ہوئے تو پھر وہی امریکہ کی لمبی پرواز اور ہم۔ امریکہ کے لئے یہ ہمارا دوسرا سفر تھا۔ اس کے لئے ہم ۱۶ر فروری ۱۹۹۱ء کی صبح فجر سے پہلے کی پرواز سے کراچی سے چلے۔ پی آئی اے کی پرواز تھی جو فرینکفرٹ سے ہوتی ہوئی نیویارک جاتی تھی۔ فرینکفرٹ پر سختی بہت تھی پاکستانیوں کے لئے جرمنی کا ویزا لازمی تھا چاہے مسافر جہاز کے اندر ہی رہیں اور ایئرپورٹ کے انتظار گھر میں بھی نہ جائیں۔ اب فرینکفرٹ آیا تو ہم جہاز سے اتر کر اس انتظار گھر میں گئے۔ اپنا ہاتھ کا سامان ساتھ لے لیا جو کافی بھاری سے بیگ میں تھا۔ لاؤنج یا انتظار گھر میں کوئی چیز نہیں تھی، نہ پی آئی اے کی طرف سے اور نہ ایئرپورٹ کی طرف سے۔ پرواز وقت پر روانہ ہونے کا اعلان ہوا، اور ہم اپنا

بیگ اٹھا کر چلنے لگے تھے کہ ایک صاحبزادے نے ہم سے کہا، ''لائیے یہ بیگ میں لے چلوں''۔ ہم نے انہیں دیکھتے ہی کہا، ''ارے گڈو، تم کہاں؟''۔ وہ مسکراتے ہوئے ساتھ چلنے لگے ایسے کہ جیسے کہ گڈو ہونے کی حامی بھر لی ہو۔ اب ہمیں احساس ہوا کہ یہ گڈّو تو نہیں، کوئی اور ہی صاحبزادے تھے۔ گڈّو ہمارے ایک عزیز کے بیٹے ہیں جو اس وقت لاس انجلس میں رہتے تھے۔ اب یہ صاحبزادے ہم سے مڑ کر کہنے لگے، ''آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں گڈّو نہیں ہوں۔ مگر مجھے بہت اچھا لگا آپ کا اس طرح بے اختیار پکارنا۔ چلیں میں تعارف کرادوں۔ میرا نام زبیر ہے''۔ بعد میں ان صاحبزادے نے بتایا کہ ان کے والد صاحب پی آئی اے میں تھے اور اس وقت نیویارک میں تعینات تھے۔ اپنا اور اپنے والد کا فون نمبر بھی دیا انہوں نے۔ یہ بھی لاس انجلس میں پڑھتے تھے۔ بتایا کہ یہ چھٹیاں کراچی میں گزار کر واپس جا رہے تھے۔ اب جہاز میں بیٹھے تو یہ بھی ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔ ہم بھی بہت خوش کہ کوئی بات کرنے والے ہمسفر کے ساتھ ہو گئے ورنہ وہی سفر ہوتا کہ سارے راستے کتابیں پڑھتے رہتے۔ زبیر سے سارے راستے سیاست سے لے کر خاندانی گفتگو کرتے ہوئے نیویارک پہنچ گئے۔ یہاں برف ہی برف تھی۔ انہوں نے اُترنے سے پہلے کہا کہ ''آج ایسا محسوس ہوا کہ اپنی امّی کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ پہلے جو سفر کئے، اس میں تو بور ہی ہوتا رہا تھا''۔ کچھ عرصہ بعد جب ہم لاس انجلس گئے تو ان صاحبزادے سے کافی عرصہ تک بات چیت چلتی رہی۔

نیویارک میں امیگریشن ہونا تھی۔ ہم یہاں ہجرتی کاغذات ('امیگریشن پیپرز') کے ساتھ آئے تھے۔ ساتھ ایکسرے، خون کی رپورٹیں، اور دوسرے کاغذات ایک بھورے لفافے میں بند تھے اور ان پر امریکی سفارتخانے کی مہر لگی تھی۔ کافی دیر لگی کاغذی کارروائیوں میں۔ یہاں سے فارغ ہو کر بیٹی کے گھر پہنچے۔ پندرہ دن بعد یکم/مارچ ۱۹۹۱ء کو، بروز شبِ برأت دوپہر ۱۲/بجے اللہ تعالیٰ نے بیٹا عنایت فرمایا۔ ماشا اللہ دس پاؤنڈ سے بھی زیادہ کا تھا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر نے صبح ۶/بجے بلایا تھا، اور ہماری طبیعت بھی دو روز سے خراب چل رہی تھی۔ لیکن ہمیں افسوس یہ ہوا کہ اس روز اس قدر شدید برف باری ہوئی تھی کہ گھر سے کوئی فرد ہسپتال نہ جا سکا۔ رات کے ۲/بجے سے برف گرنا شروع ہوئی تھی اور دن ہونے تک ساری کاریں برف میں دب گئی تھی۔ سیما کے شوہر ہمّت کر کے برف ہٹاتے رہے تھے اور پھر شام ہونے تک برف کی جگہ بارش شروع ہو گئی اور برف پگھلنے لگی تو سڑکوں پر نمک چھڑکنے والے ٹرک چلنے لگے تاکہ اگر رات کو برف پگھلے تو سڑکوں پر گاڑیاں اِدھر سے اُدھر پھسلتی نہ پھریں۔ نمک کی وجہ سے برف کافی اوپر کے درجہ حرارت تک پگھلتی نہیں۔ اِدھر گھر کے

دروازے کے سامنے کئی انچ برف پڑی ہوئی تھی۔ بارش سے برف کچھ پگھلی تو نمک نے بھی کچھ کام نہیں کیا۔ برف پر جہاں پیر رکھو، غڑپ سے پیر اندر۔ شام تک سب اس قابل ہوئے کہ ہسپتال جائیں۔ ہم اسی حالت میں شام کو ہسپتال پہنچے۔ وہاں بیٹی سے مل کے اور بچے کو دیکھ کر گھر آتے ہوئے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سیما جب واپس گھر آئیں تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے تین ماہ تک کوئی بھاری شئے کو اٹھانے سے منع کیا تھا اور کئی دن تک مکمل آرام کی تاکید کی تھی۔ سو ہم اِن کا ساتھ دینے کے لئے اپریل کے آخر تک اِسی گھر میں رہے۔ سردی اِس قدر تھی کہ بس گھر میں ہی رہتے، یا کبھی عزیز رشتہ داروں کے گھر چلے گئے۔ اپریل کے آخر میں ایک دن اچھا تھا تو ہم سرسری طور پر مین ہٹن گئے اور ایک دن میں تمام اونچی عمارتیں دیکھ ڈالیں جن میں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر بھی تھے۔ دور سے ایلس آئلینڈ اور مجسمہ آزادی بھی دیکھا۔ آنے جانے کے لئے نیویارک کی سب وے کی جو تھی تو کافی کارآمد لیکن بہت بری طرح استعمال کی جاتی تھی اور گندی بھی تھی۔

نیویارک: اپریل کے آخر میں بھی برفیلی ہوائیں۔

اسی اثناء میں ہمارے تیسرے بیٹے اعجاز کی نئی نویلی دلہن فرحانہ کراچی سے السوبرانتے پہنچ چکی تھیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر ہم نے سان فرانسسکو روانہ ہونے کی تیاری کی۔ اپنے نئے اور پہلے نواسے جعفر کو خوب پیار کیا، دعائیں دیں اور بلائیں لیں۔

چلتے چلتے خیال ہوا کہ ویسے تو ہمارے بیٹے یہاں کی شہریت پہلے ہی اختیار کر چکے تھے، مگر یہ جعفر صاحب ہمارے خاندان میں پہلے "پیدائشی" امریکی تھے۔